مانگتا رہتا ہے۔ (بخاری، جلد دوم، ص۳۷)

(۶) حضرت ابوہریرہؓ کی روایت کے مطابق ایک مرتبہ جہنم نے خدا سے دم گھٹنے کی شکایت کی، اور سانس لینے کی اجازت مانگی۔ اللہ نے فرمایا تو سال میں دو سانس لے سکتی ہے۔ چنانچہ انہی سے دونوں موسم (گرما و سرما) پیدا ہوئے۔ (بخاری، جلد دوم، ص۱۴۳)

(۷) مرد کا نطفہ سفید ہوتا ہے اور عورت کا زرد۔ انزال کے بعد یہ دونوں قسم کے نطفے مل جاتے ہیں۔ اگر یہ مرکب مائل بہ سفیدی ہو تو بچہ پیدا ہوتا ہے ورنہ بچی۔ (مسلم جلد اول، ص۱۶۸)

(۸) مجامعت کے وقت اگر مرد کا انزال عورت سے پہلے ہو تو بچہ باپ پر جاتا ہے ورنہ ماں پر۔ (بخاری، جلد دوم، ص۱۴۹)

توہینِ انبیاء

(۹) حضرت ابوہریرہؓ کی روایت کے مطابق حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ختنہ اسّی برس کی عمر میں ہوا تھا۔ (بخاری، جلد دوم، ص۱۵۵)

(۱۰) حضرت ابوہریرہؓ کی روایت کے مطابق نبی صلعم نے فرمایا کہ ایک دن حضرت سلیمان نے ارشاد فرمایا کہ آج رات میں اپنی تمام بیویوں سے، جن کی تعداد ایک سو ایک یا ننانوے تھی، مجامعت کرونگا۔ ہر ایک بیوی سے ایک شہسوار پیدا ہوگا جو خدا کی راہ میں جہاد کرے گا۔ کسی نے کہا انشاء اللہ بھی ساتھ کہیے۔ لیکن حضرت سلیمان نے پروا نہ کی۔ چنانچہ وہ تمام بیویوں کے پاس گئے لیکن ایک کے سوا کوئی حاملہ نہ ہوئی (بخاری، جلد دوم، ص۹۳)

(۱۱) حضرت حذیفہ کی روایت ہے کہ نبی صلعم کھاد کے ایک ڈھیر کے قریب گئے اور میرے سامنے کھڑے ہو کر پیشاب کیا۔ (بخاری، جلد اول، ص۳۶)

(۱۲) بخاری میں حضرت ابراہیم علیہ السلام (جنہیں قرآن نے صدیق نبی کا خطاب دیا ہے) کے تین جھوٹ کا ذکر ہے اور یہ تین جھوٹ بھی اس شدید نوعیت کے کہ ان کی وجہ سے وہ قیامت کے دن شفاعت کرنے سے ترمندہ ہونگے (مسلم، جلد اول، ص۳۷۲)۔ ان میں سے

دو واقعات کا ذکر تو قرآن نے بھی کیا ہے۔ لیکن تیسرا واقعہ، یعنی حضرت ابراہیمؑ کا ایک زانی بادشاہ کے خوف سے اپنی بیوی کو بہن ظاہر کرنا تو قرآن میں کہیں مذکور نہیں۔

خلافِ انصاف

(۱۳) ام شریک کی روایت (بخاری، جلد دوم، صـ۱۵۳) کے مطابق نبی صلعم نے چھپکلی کو مارنے کا حکم دیا تھا کیونکہ یہ اُس آگ کو پھونکوں سے بھڑکاتی تھی جس میں حضرت ابراہیمؑ کو پھینکا گیا تھا۔ سوال یہ ہے کہ ایک چھپکلی کی پھونکوں میں آگ بھڑکانے کی طاقت کہاں سے آگئی؟ اور پھر ایک چھپکلی کے جرم کے بدلے چھپکلیوں کی ساری نسل کو سزا دینا کہاں کا انصاف ہے؟

(۱۴) ایک روایت کے مطابق عورت، گدھا، اور کتا سامنے سے گزر جائے تو نماز ٹوٹ جاتی ہے۔ (مسلم، جلد دوم، صـ۱۱۱)

متفرق

(۱۵) اگر مکھی کسی پینے کی چیز میں گر جائے تو اسے غوطہ دیکر نکالو، کیونکہ اس کے ایک پر میں بیماری ہوتی ہے اور دوسرے میں شفا۔ (بخاری، جلد دوم، صـ۱۴۸)

مندرجۂ بالا احادیث میں سے اکثر بخاری شریف سے لی گئی ہیں جو ہمارے عقیدے کے مطابق اصح الکتب بعد کتاب اللہ ہے۔ براہِ کرم اسکی بھی وضاحت کر دیجیے کہ اصح الکتب کا مطلب آیا یہ ہے کہ بخاری بھی قرآن کی طرح حرفاً حرفاً صحیح اور غیر محرّف ہے؟

جواب:۔ آپ کے سوال کا جواب دینے سے پہلے یہ شکایت عرض ہے کہ آپنے تمام احادیث کے حوالے بخاری و مسلم کی جلدوں اور صفحات کے نمبروں کی صورت میں دیے ہیں، حالانکہ اِن کتابوں کو دنیا کے بیسیوں مطابع نے مختلف سائزوں پر بارہا طبع کیا ہے، اور ضروری نہیں ہے کہ ان کا جو ایڈیشن آپ کے پاس ہو وہی دوسرے کے پاس بھی ہو۔ ایسی کتابوں کا حوالہ ہمیشہ ان کی "کتاب" اور باب کے عنوان سے دینا چاہیے تاکہ آدمی آسانی سے مطلوبہ حدیث تلاش کر سکے۔

آپ کے سوالات دیکھنے سے شبہ ہوتا ہے کہ غالباً آپ نے خود ان کتابوں کا بالاستیعاب

مطالعہ نہیں فرمایا ہے بلکہ منکرینِ حدیث نے فتنہ پردازی کی غرض سے "قابلِ اعتراض" حدیثوں کی جو فہرستیں مرتب کر کے شائع کی ہیں انہی میں سے کوئی فہرست آپ کی نگاہ سے گذری ہے، اور آپ نے زیادہ سے زیادہ بس اتنی تحقیق کی زحمت اٹھائی ہے کہ اس فہرست کی حدیثوں کو بخاری و مسلم کے کسی نسخے میں نکال کر یہ اطمینان کر لیا ہے کہ یہ حدیثیں وہاں موجود ہیں۔ میرے اس شبہ کی بنیاد یہ ہے کہ آپ کی پیش کردہ اکثر احادیث ایسی ہیں جن پر آپ کو اپنے شبہات کا جواب خود اُسی کتاب کے اُسی باب میں مل جاتا اگر آپ پورا باب پڑھنے کی تکلیف گوارا فرماتے۔ بلکہ بعض حدیثوں کے تو آپ نے پورے الفاظ تک نہیں پڑھے ہیں اور ان کا وہی غلط سلط مفہوم نقل کر دیا ہے جو اس فتنہ پرداز گروہ نے اپنی طرف سے گھڑ کر بیان کیا ہے۔ اس طریقے سے یہ لوگ کم سواد لوگوں کو تو دھوکا دے ہی رہے ہیں، مگر یہ دیکھ کر سخت افسوس ہوتا ہے کہ آپ جیسے اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ بھی اس آسانی کے ساتھ دھوکا کھا جاتے ہیں۔ کیا آپ کو معلوم نہیں ہے کہ دنیا کے کسی علم و فن کے مسائل پر بھی آدمی اتنے سرسری مطالعے سے کوئی صحیح رائے قائم نہیں کر سکتا جسے آپ حدیث کے معاملے میں کافی سمجھ رہے ہیں؟ جس طریقے سے آپ نے حدیث کی چند باتیں سیاق و سباق اور موضوع سے الگ کر کے اور ان کا بالکل ایک سرسری مفہوم اخذ کر کے نقل کی ہیں، اس طریقے سے تو دنیا کے ہر علم و فن کی کتابوں سے اقتباسات نکال کر محض مضحکہ بنانے کے لیے پیش کیے جا سکتے ہیں۔

اس مختصر تنبیہ کے بعد میں آپ کی پیش کردہ احادیث میں سے ہر ایک پر مفصل کلام کروں گا، تاکہ نہ صرف آپ کو، بلکہ منکرینِ حدیث کے فتنے سے دھوکا کھانے والے دوسرے اصحاب کو بھی تحقیق کا صحیح طریقہ معلوم ہو سکے۔

(۱) حضرت عائشہؓ کے غسل والی حدیث بخاری کتاب الغسل، باب الغسل بالصاع ونحوہ میں ہے۔ اس میں ابو سلمہؒ بیان فرماتے ہیں کہ "میں اور حضرت عائشہؓ کے بھائی حضرت عائشہؓ کے پاس گئے اور حضرت عائشہؓ کے بھائی نے ان سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے غسل کی بابت دریافت کیا۔ اس پر حضرت عائشہؓ نے ایک برتن منگایا جو قریب قریب ایک صاع کے برابر تھا، اور انہوں نے غسل

کیا اور اپنے سر پر پانی بہایا اس حال میں کہ ہمارے اور ان کے درمیان پردہ تھا۔"

اس حدیث پر اعتراض کرنے والوں کی پہلی غلطی یہ ہے کہ وہ ابو سلمہ کا نام پڑھ کر یہ سمجھ لیتے ہیں کہ وہ کوئی غیر شخص تھے۔ حالانکہ وہ حضرت عائشہ کے رضاعی بھانجے تھے جنہیں حضرت ام کلثوم بنت ابی بکر صدیقؓ نے دودھ پلایا تھا۔ پس دراصل یہ دونوں صاحب جو حضرت عائشہؓ سے مسئلہ پوچھنے گئے تھے، آپ کے محرم ہی تھے، ان میں سے کوئی غیر نہ تھا۔

پھر دوسری غلطی، بلکہ زیادتی وہ یہ کرتے ہیں کہ روایت میں تو صرف "حجاب" یعنی پردے کا ذکر ہے، مگر یہ لوگ اپنی طرف سے اس میں یہ بات بڑھا لیتے ہیں کہ وہ پردہ باریک تھا، اور اس اضافے کے لیے وہ دلیل یہ دیتے ہیں کہ اگر باریک نہ ہوتا جس میں سے حضرت عائشہ نہاتی ہوئی نظر آسکتیں تو پھر اسے درمیان میں ڈال کر نہانے سے کیا فائدہ تھا؟ حالانکہ اگر انہیں یہ معلوم ہوتا کہ اُس وقت مسئلہ کیا درپیش تھا جس کی تحقیق کے لیے یہ دونوں صاحب اپنی خالہ اور بہن کے پاس گئے تھے، تو انہیں اپنے اس سوال کا جواب بھی مل جاتا، اور یہ سوچنے کی ضرورت بھی پیش نہ آتی کہ وہ پردہ باریک ہونا چاہیے تھا۔

دراصل وہاں سوال یہ نہ تھا کہ غسل کا طریقہ کیا ہے۔ بلکہ بحث یہ چھڑ گئی تھی کہ غسل کے لیے کتنا پانی کافی ہو سکتا ہے۔ بعض لوگوں کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق یہ روایت پہنچی تھی کہ آپ ایک صاع بھر پانی سے غسل کر لیتے تھے۔ اتنے پانی کو لوگ غسل کے لیے ناکافی سمجھتے تھے اور بنائے غلط فہمی یہ تھی کہ وہ غسلِ نہایت اور غسل بغرضِ صفائی بدن کا فرق نہیں سمجھ رہے تھے۔ حضرت عائشہؓ نے ان کو تعلیم دینے کے لیے بیچ میں ایک پردہ ڈالا جس سے صرف ان کا سر اور چہرہ اُن دونوں صاحبوں کو نظر آتا تھا اور پانی منگا کر اپنے اوپر بہایا۔ اس طریقے سے حضرت عائشہ ان کو دو باتیں بتانا چاہتی تھیں۔ ایک یہ کہ غسلِ جنابت کے لیے صرف جسم پر پانی بہانا کافی ہے، دوسرے یہ کہ اس مقصد کے لیے ایک صاع بھر پانی کفایت کرتا ہے۔

اس تشریح کے بعد آپ خود سوچیں کہ اس میں آخر قابلِ اعتراض کیا چیز ہے جس کی بنا پر خواہ مخواہ ایک مستند حدیث کا انکار کرنے کی ضرورت پیش آئے، اور پھر اسے تمام حدیثوں کے غیر معتبر ہونے پر دلیل ٹھیرایا جائے؟

(۲-۳) حضرت سَبُرۃ الجُہنی اور حضرت جابر والی حدیثیں مسلم باب نکاح المتعۃ میں موجود ہیں، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ معترضین نے صرف اعتراض کی خاطر حدیثیں تلاش کرنی شروع کیں، اور اس سلسلہ میں ان دونوں حدیثوں کو بھی اپنی فہرست میں ٹانک لیا۔ ورنہ اگر وہ یہ جاننے کی کوشش کرتے کہ متعہ کی حقیقت کیا ہے، اور اس کے بارے میں فقہاء کے درمیان کیا بحثیں پیدا ہوئی تھیں، اور ان بحثوں کا تصفیہ کرنے کے لیے محدثین نے کس مقصد کے لیے وہ تمام روایات اپنی کتابوں میں جمع کیں جو متعہ کے جواز اور حرمت کے متعلق ان کو مختلف سندوں سے پہنچی تھیں، تو شاید وہ ان احادیث پر نظرِ عنایت نہ فرماتے۔

اصل معاملہ یہ ہے کہ اسلام سے قبل، زمانۂ جاہلیت میں نکاح کے جو طریقے رائج تھے، ان میں سے ایک "نکاحِ مُتعہ" بھی تھا، یعنی کسی عورت کو کچھ معاوضہ دے کر ایک خاص مدت کے لیے اس سے نکاح کرنا۔ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا قاعدہ یہ تھا کہ جب تک اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کو کسی چیز کی نہی کا حکم نہ مل جاتا تھا، آپ پہلے کے رائج شدہ طریقوں کو منسوخ نہ فرماتے تھے، بلکہ یا تو ان کے رواج پر سکوت اختیار فرماتے، یا بوقتِ ضرورت ان کی اجازت بھی دے دیتے۔ چنانچہ یہی صورت متعہ کے باب میں بھی پیش آئی کہ ابتداءً آپ نے اس کے رواج پر سکوت اختیار فرمایا، اور بعد میں کسی جنگ یا سفر کے موقع پر اگر لوگوں نے اپنی شہوانی ضرورت کی شدت ظاہر کی تو آپ نے اس کی اجازت بھی دے دی، کیونکہ حکمِ نہی اس وقت تک نہ آیا تھا۔ پھر جب حکمِ نہی آگیا تو آپ نے اس کی قطعی ممانعت فرما دی، لیکن یہ حکم تمام لوگوں تک نہ پہنچ سکا، اور اس کے بعد بھی کچھ لوگ ناواقفیت کی بنا پر متعہ کرتے رہے۔ آخر کار حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے دور میں اس حکم کی عام اشاعت کی اور پوری قوت کے ساتھ اس رواج کو بند کیا۔

اس مسئلے میں فقہاء کے سامنے متعدد سوالات تحقیق طلب تھے۔ مثلاً یہ کہ آیا حضور نے کبھی اس کی صریح اجازت بھی دی تھی؟ اور اگر دی تھی تو کس موقع پر؟ اور یہ کہ آپ نے اس سے منع فرمایا ہے یا نہیں؟ اور منع فرمایا ہے تو کب اور کن الفاظ میں؟ اور یہ کہ آیا اس کی تحریم حضور کا اپنا فعل ہے یا حضرت عمرؓ نے اپنی ذمہ داری پر اس رواج کو بند کیا؟ یہ اور اس طرح کے متعدد دوسرے سوالات تھے جن کی تحقیق کے لیے فقہاء و محدثین کو وہ تمام روایات جمع کرنے کی ضرورت پیش آئی جو اس مسئلے سے متعلق

مختلف لوگوں کے پاس موجود تھیں۔ اسی سلسلے میں امام مسلم نے وہ دونوں روایات بھی نقل کی ہیں جن کو معترضین نے اعتراض کے لیے چھانٹا ہے۔

ان میں سے ایک حضرت جابر بن عبداللہ کی روایت ہے جس میں وہ بیان کرتے ہیں کہ ہم نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکرؓ کے عہد میں متعہ کرتے تھے، پھر حضرت عمرؓ نے اپنے عہد میں اس کی ممانعت کر دی۔ دوسری حدیث سبرۃ الجہنی کی ہے جو بیان کرتے ہیں کہ فتح مکہ کے موقع پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی اجازت دی تھی، چنانچہ میں نے خود ایک چادر کے عوض ایک عورت سے متعہ کیا، مگر بعد میں اسی غزوے کے زمانے میں آپ نے اعلان فرما دیا کہ اللہ تعالیٰ نے متعہ کو قیامت تک کے لیے حرام کر دیا ہے۔ ان کے علاوہ اور بہت سی احادیث مسلم اور دوسرے محدثین نے جمع کی ہیں جو اس مسئلے کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالتی ہیں۔ سوال یہ ہے کہ اگر محدثین یہ مواد جمع نہ کرتے تو اسلامی قانون کی تدوین کرنے والے آخر کس بنیاد پر متعے کے جواز و عدم جواز کا فیصلہ کرتے؟

(۴) حضرت جابر کی یہ روایت مسلم، کتاب الحج، باب بیان وجوہ الاحرام میں ہے جس میں قواعد احرام سے تعلق رکھنے والی روایات جمع کی گئی ہیں۔ اس سلسلے میں امام مسلم نے حضرت جابر کی بھی متعدد روایات نقل کی ہیں جن میں وہ بیان کرتے ہیں کہ ہم لوگ محض حج کی نیت کر کے مدینہ سے نکلے تھے۔ جب ۴ ذی الحجہ کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم مکہ معظمہ پہنچے تو آپ نے فرمایا کہ تم میں سے جو لوگ ہدی نہیں لائے ہیں وہ احرام کھول دیں اور اپنی بیویوں کے پاس جائیں۔ یہ آپ کا حکم نہ تھا بلکہ مقصود یہ بتانا تھا کہ احرام کھول کر تم ایسا کر سکتے ہو۔ چنانچہ ہم نے طواف کعبہ اور سعی بین الصفا والمروہ کر کے احرام کھول دیے اور اپنی بیویوں کے پاس گئے۔ اس موقع پر جو لوگ احرام کھولتے ہوئے جھجک رہے تھے انہیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سمجھایا کہ میں تم سے زیادہ خدا سے ڈرنے والا ہوں، اگر میں اپنے ساتھ ہدی نہ لایا ہوتا تو میں بھی تمہارے ساتھ ہی احرام کھول دیتا۔ اس پر وہ مطمئن ہو گئے اور سب نے ارشاد کی تعمیل کی۔

یہ واقعات حضرت جابرؓ نے جس غرض کے لیے بیان کیے تھے وہ یہ تھی کہ بعد میں بھی بہت سے لوگوں کے دلوں میں یہ شک باقی رہ گیا تھا کہ جو شخص احرام باندھ کر حج سے پہلے مکے پہنچا ہو، وہ آیا طواف و سعی

کرنے کے بعد حلال ہو سکتا ہے یا نہیں، اور آیا اس کے لیے یہ جائز ہے کہ وہ حج کا زمانہ آنے پر حرم ہی سے احرام کا آغاز کرے۔ اسی شک کو دُور کرنے کے لیے حضرت جابرؓ نے زور دے کر کہا کہ خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ہم عرفہ اس حال میں پہنچے ہیں کہ تقطر مذاکیرنا المنی۔ اِس طرزِ تعبیر پر کسی کا جی چاہے تو ناک بھوں چڑھالے، مگر حضرت جابرؓ کا مقصود ان شک کرنے والوں کو یہ بتانا تھا کہ عرفہ جانے سے ایک ہی دن پہلے ہم مباشرت کر چکے تھے اور تازہ تازہ احرام باندھ کر نکلے تھے، اور یہ ہم نے حضور کی ہدایت کے مطابق کیا تھا، پھر اس مسئلے میں تمہارے شک کرنے کی کیا معقول وجہ ہے۔

(۵) حضرت ابوذر کی یہ حدیث بخاری کتاب بدء الخلق، باب صفت الشمس والقمر میں ہے اس کا جو خلاصہ آپ نے دیا ہے وہ صحیح نہیں ہے۔ اس کا صحیح ترجمہ یہ ہے کہ "نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، جانتے ہو سورج غروب ہو کر جاتا کہاں ہے؟ مَیں نے عرض کیا اللہ اور اس کا رسول زیادہ جانتے ہیں۔ فرمایا وہ جاتا ہے اور عرش کے نیچے سجدہ کرتا ہے اور اجازت مانگتا ہے (یعنی پھر مشرق سے طلوع ہونے کی) اور اسے اجازت دے دی جاتی ہے۔ ایک وقت آئے گا کہ وہ سجدہ کرے گا اور اجازت مانگے گا مگر اجازت نہ ملے گی اور حکم ہوگا کہ پلٹ جا اور وہ مغرب سے طلوع ہوگا۔ پھر آپ نے یہ آیت پڑھی والشمس تجری لمستقر لہا ذالک تقدیر العزیز العلیم"۔

اس میں دراصل جو مضمون بیان کیا گیا ہے وہ صرف یہ ہے کہ "سورج ہر آن اللہ تعالیٰ کے حکم کا تابع ہے، اس کا طلوع بھی اللہ ہی کے حکم سے ہوتا ہے اور اس کا غروب بھی" سورج کا سجدہ کرنا ظاہر ہے کہ اس معنی میں نہیں ہے جس میں ہم نماز میں سجدہ کرتے ہیں، بلکہ اُس معنی میں ہے جس میں قرآن دنیا کی ہر چیز کو خدا کے آگے سر بسجود قرار دیتا ہے، یعنی کلیتہً تابع امر رب ہونا۔ پھر سورج کا مغرب بھی ایک نہیں ہے بلکہ قرآن کی رو سے بہت سے مغرب ہیں، کیونکہ وہ ہر آن ایک خطۂ زمین میں غروب اور ہر آن دوسرے خطے میں طلوع ہوتا ہے۔ اس لیے اجازت مانگ کر طلوع و غروب ہونے کا مطلب ہر آن امرِ الٰہی کے تحت ہونا ہے۔ رہا اس کا کسی وقت مغرب سے طلوع ہونا، تو یہ بھی کوئی بعید بات نہیں ہے۔ ہر وقت اس امر کا امکان ہے کہ دنیا کا قانونِ جذب و کشش یکایک

ایک پٹی کھا جائے اور سیاروں کی رفتار بالکل اُلٹ جائے۔ طبعیات اور ہیئت کے ماہرین میں سے کوئی بھی اس قانون کو اٹل نہیں مانتا اور نہ اس میں تغیر واقع ہونے، یا اس کے بالکل درہم برہم ہو جانے کو ناممکن سمجھتا ہے۔

رہا یہ امر کہ اس حدیث میں طلوع و غروب کو سورج کی گردش کا نتیجہ سمجھا گیا ہے نہ کہ زمین کی گردش کا، تو اس پر اعتراض کرنے والے کو دو باتیں اچھی طرح جان لینی چاہئیں۔ اوّل یہ کہ انبیاء علیہم السلام طبعیات اور ہیئت اور کیمیا کے مسائل بتانے کے لیے نہیں آئے تھے بلکہ عرفانِ حقیقت بخشنے اور فکر و عمل کی تصحیح کرنے کے لیے آئے تھے۔ ان کا کام یہ بتانا نہ تھا کہ زمین حرکت کرتی ہے یا سورج، بلکہ یہ بتانا تھا کہ ایک ہی خدا زمین اور سورج کا مالک و فرمانروا ہے، اور ہر چیز ہر آن اس کی بندگی کر رہی ہے۔ دوسرے یہ کہ یہ بات حکمتِ تبلیغ کے بالکل خلاف ہے کہ مبلغ کے اپنے زمانے میں جو علم اشیاء موجود ہو اُس کو چھوڑ کر وہ ہزارہا سال بعد کے علمِ اشیاء کو تعلیم حقیقت کا ذریعہ بنائے۔ اُسے جن حقائق کو ذہن نشین کرنا ہوتا ہے اُن کی تفہیم کے لیے اس کو لامحالہ اپنے زمانے ہی کے مواد علمی سے کام لینا پڑتا ہے، ورنہ اگر وہ اُن معلومات سے کام لے جو صدیوں بعد انسان کے علم میں آنے والی ہوں تو اس کے معاصرین اس کی اصل تعلیم کو چھوڑ کر اس بحث میں لگ جائیں کہ یہ شخص کس عالم کی باتیں کر رہا ہے، اور ان میں کا ایک شخص بھی اس کی تبلیغ سے متاثر ہو کر نہ دے۔ اب آپ خود سوچ لیں کہ اگر کسی نبی کی تعلیم اس کے معاصرین ہی کی سمجھ میں نہ آتی اور اس کے عہد کے لوگوں ہی میں مقبول نہ ہوتی، تو وہ بعد کی نسلوں تک پہنچتی کیسے؟ اب سے ڈیڑھ ہزار برس پہلے اگر اوپر والی حدیث کا مضمون اس ڈھنگ سے بیان کیا جاتا کہ سننے والا طلوع و غروب کا سبب سورج کے بجائے زمین کی حرکت کو سمجھتا تو بے شک آج کے لوگ اسے علم کا ایک معجزہ قرار دیتے، مگر آپ کا کیا خیال ہے کہ خود اُس زمانے کے لوگ اِس معجزۂ علمی کا استقبال کس طرح کرتے؟ اور پھر وہ اصل بات بھی کہاں تک ان کے دل و دماغ میں اترتی جو اس مضمون میں بیان کرنی مقصود تھی؟ اور جبکہ اُس عہد کے لوگ ہی ایسے "علمی معجزات" کی بدولت ایمان لانے سے محروم رہ جاتے تو یہ معجزے آپ تک پہنچتے ہی کب کہ

آپ ان کی داد دیتے ؟

(۶) حضرت ابو ہریرہؓ کی یہ روایت بخاری کتاب مواقیت الصلاۃ، باب الابراد بالظہر فی شدۃ الحر میں ہے۔ اس کا خلاصہ بھی آپ نے صحیح بیان نہیں کیا ہے۔ اس کا صحیح ترجمہ یہ ہے: "نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب گرمی کا زور ہو تو ظہر کی نماز ٹھنڈی کر کے پڑھو (یعنی دیر کر کے پڑھو جبکہ گرمی کی شدت میں کمی ہو جائے) کیونکہ گرمی کی شدت جہنم کی بھونک سے ہے۔ جہنم نے اپنے رب سے شکایت کی اور کہا کہ اے رب میرے اجزاء ایک دوسرے کو کھائے جاتے ہیں۔ اُس کے رب نے اسے دو مرتبہ سانس لینے کی اجازت دے دی ایک مرتبہ جاڑے میں اور دوسری مرتبہ گرمی میں۔ گرمی کا سانس اُس شدید ترین گرمی جیسا ہوتا ہے جو تم لوگ موسم گرما میں پاتے ہو، اور سردی کا سانس اس شدید ترین سردی جیسا ہوتا ہے جو تم موسم سرما میں پاتے ہو۔"

اس حدیث پر اعتراض کرنے سے پہلے اس امر پر غور کر لیجیے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا اصل مقصد اس بیان سے آخر کیا ہو سکتا تھا؟ کیا یہ کہ آپ ایک عالم طبیعیات کی حیثیت سے موسمی تغیرات کے وجوہ بیان فرمانا چاہتے تھے؟ یا یہ کہ آپ ایک نبی کی حیثیت سے گرمی کی تکلیف محسوس کرنے والوں کو جہنم کا تصور دلانا چاہتے تھے؟ جس شخص نے بھی قرآن اور سیرت نبی پر کچھ غور کیا ہوگا وہ بلا تأمل کہہ دیگا کہ آپ کی حیثیت پہلی نہ تھی بلکہ دوسری تھی، اور گرمی کی شدت کے زمانے میں ظہر کی نماز ٹھنڈی کر کے پڑھنے کا حکم دیتے ہوئے آپ نے جو کچھ فرمایا اس سے آپ کا مقصد دوزخ سے ڈرانا اور اُن کاموں سے روکنا تھا جو آدمی کو دوزخ کا مستحق بناتے ہیں۔ اس لحاظ سے آپ کا یہ ارشاد قرآن کے اُس ارشاد سے ملتا جلتا ہے جو غزوۂ تبوک کے موقع پر فرمایا گیا تھا کہ وَقَالُوْا لَا تَنْفِرُوْا فِی الْحَرِّ، قُلْ نَارُ جَهَنَّمَ اَشَدُّ حَرًّا "انہوں نے کہا کہ اس شدید گرمی میں جہاد کے لیے نہ نکلو۔ اے نبی ان سے کہو کہ جہنم کی آگ اس گرمی سے زیادہ گرم ہے۔" جس طرح یہاں قرآن علم طبیعیات کا کوئی مسئلہ بیان نہیں کر رہا ہے، اسی طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث بھی طبیعیات کا درس دینے کے لیے نہیں ہے۔ قرآن دنیا کی گرمی کا جہنم کی گرمی سے مقابلہ اس لیے کر رہا ہے کہ پس منظر میں وہ لوگ موجود تھے جو اس گرمی سے گھبرا کر جہاد کے لیے نکلنے سے

جی چُھا رہے تھے۔ اسی طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم بھی دنیا کی شدید گرمی اور شدید سردی کو دوزخ کی محض دو پھونکوں کے برابر اس لیے بتا رہے ہیں کہ پس منظر میں وہ لوگ موجود تھے جو جاڑے میں صبح کی اور گرمی میں ظہر کی نماز کے لیے نکلنے سے گھبراتے تھے۔ چنانچہ مسند احمد میں زید بن ثابت کی یہ روایت آئی ہے کہ لم یکن یصلی صلوٰۃ اشد علی اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم منہا "ظہر کی نماز سے بڑھ کر کوئی نماز اصحاب رسول اللہ پر شاق نہ تھی" اور اس کا اندازہ ہر وہ شخص کر سکتا ہے جس نے گرمی کے زمانے میں عرب کی دوپہر کبھی دیکھی ہو۔

اس کے بعد اب حدیث کے اصل الفاظ کی طرف آیئے۔ فان شدۃ الحر من فیح جھنم (گرمی کی شدت جہنم کی پھونک سے ہے)، کے معنی لازماً یہی نہیں ہیں کہ دنیا میں گرمی جہنم کی پھونک کی وجہ سے ہوتی ہے، بلکہ اس کے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ وہ جہنم کی پھونک کی قسم یا جنس سے ہے اس لیے کہ عربی زبان میں لفظ مِنْ بیانِ جنس کے لیے بکثرت استعمال ہوتا ہے اور خود قرآن میں اس کی بہت سی مثالیں موجود ہیں۔ جیسے ما یفتح اللہ للناس من رحمۃ ۔ مما تنبت من ایتہ ۔ اور اجتنبوا الرجس من الاوثان ۔

رہا آخری فقرہ تو اس میں یہ نہیں کہا گیا ہے کہ دنیا میں گرمی اور جاڑے کے موسم دوزخ کی ان دو پھونکوں کے سبب سے آتے ہیں، بلکہ الفاظ یہ ہیں فاذن لھا بنفسین، نفس فی الشتاء و نفس فی الصیف اشد ما تجدون من الحر و اشد ما تجدون من الزمھریر (پس اس کے رب نے اس کو دو سانسوں کی اجازت دی۔ ایک سانس جاڑے میں اور ایک سانس گرمی میں، جو اس شدید ترین گرمی جیسا ہے جو تم پاتے ہو اور اس شدید ترین سردی جیسا ہے جو تم پاتے ہو)۔

(۷-۸) یہ حدیثیں مسلم نے کتاب الحیض، باب صفتہ منی الرجل والمرأۃ میں، اور بخاری نے کتاب العلم، کتاب الغسل، کتاب الادب اور کتاب الانبیاء کے مختلف ابواب میں نقل کی ہیں مگر آپ نے ان کا مفہوم بھی غلط نقل کیا ہے۔ اصل بات جو مختلف روایتوں میں بیان ہوئی ہے وہ یہ ہے ام سُلیم نے آکر نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ اگر عورت خواب میں وہ کچھ دیکھے جو

مرد دیکھا کرتا ہے (یعنی اس کو احتلام ہو) تو کیا کرے؟ آپ نے فرمایا غسل کرے۔ اس پر حضرت ام سلمہ نے عرض کیا "عورت کو بھی یہ معاملہ پیش آتا ہے؟" ان کا مطلب یہ تھا کہ کیا عورت کو بھی انزال اور احتلام ہوا کرتا ہے؟ حضور نے جواب دیا:۔

نعم، فمن این یکون الشبه، ان ماء الرجل غلیظ ابیض وماء المرأة رقیق اصفر فمن ایهما علا او سبق یکون منه الشبه

ہاں، ورنہ آخر بچہ ماں کے مشابہ کیسے ہو جاتا ہے، مرد کا پانی گاڑھا سپیدی مائل ہوتا ہے اور عورت کا پانی پتلا زردی مائل۔ پھر ان میں سے جو بھی غالب آجاتا ہے یا جو بھی سبقت لے جاتا ہے بچہ اسی کے مشابہ ہوتا ہے

ایک دوسری روایت میں ہے کہ ایک خاتون کے سوال پر حضرت عائشہ نے بھی اسی طرح کے تعجب کا اظہار کیا تھا اور اس پر حضور نے فرمایا تھا:۔

وهل یکون الشبه الا من قبل ذالك اذا علا ماؤها ماء الرجل اشبه الولد اخواله واذا علا ماء الرجل ماءها اشبه الولد اعمامه

اور کیا بچے کا ماں کے مشابہ ہونا اس کے سوا کسی اور وجہ سے ہوتا ہے؟ جب عورت کا پانی مرد کے پانی پر غالب آجاتا ہے تو بچہ اپنی ننہیال پر جاتا ہے اور جب مرد کا پانی عورت کے پانی پر غالب آتا ہے تو بچہ ددھیال پر جاتا ہے۔

ایک اور روایت میں ہے کہ ایک یہودی عالم نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اولاد کے بارے میں سوال کیا تو آپ نے جواب میں فرمایا:

ماء الرجل ابیض وماء المرأة اصفر فاذا اجتمعا فعلا منی الرجل منی المرأة اذکرا باذن الله واذا علا منی المرأة منی الرجل انثا باذن الله

مرد کا پانی سفیدی مائل اور عورت کا پانی زردی مائل ہوتا ہے۔ جب یہ دونوں ملتے ہیں اور مرد کی منی عورت کی منی پر غالب آتی ہے تو اللہ کے حکم سے بیٹا ہوتا ہے اور جب عورت کی منی مرد کی منی پر غالب آتی ہے تو اللہ کے حکم سے لڑکی ہوتی ہے۔

آپ نے خدا جانے کس لفظ کا مطلب یہ سمجھا کہ "اگر یہ مرکب مائل بہ سفیدی ہو تو بچہ پیدا ہوتا ہے ورنہ بچی"۔ اور یہ کس عبارت کا ترجمہ آپ نے فرمایا ہے کہ "اگر مجامعت کے وقت مرد کا انزال عورت سے پہلے ہو تو بچہ باپ پر جاتا ہے ورنہ ماں پر"؟ اصل مضمون جو ان احادیث میں بیان ہوا ہے، اگر اُس کے خلاف علم و عقل کی کوئی شہادت موجود ہو تو ضرور پیش فرمائیں۔

(۹) اس معنی کی روایات بخاری کی کتاب الانبیاء، کتاب الاستیذان اور کتاب العقیقہ میں موجود ہیں۔ مگر ہر جگہ اختتن کے الفاظ ہیں جو صریح طور پر اس مفہوم کے محتمل ہیں کہ حضرت ابراہیم نے اپنے ختنے خود اپنے ہاتھ سے کر لیے۔ اور جبکہ یہ کام ایک شخص خود بھی کر سکتا ہے تو آخر کیوں یہ معنی لیے جائیں کہ ایک ۸۰ برس کی عمر کے شخص نے جراح کو بلا کر یہ کام کرایا ہوگا۔ پھر مسند ابی یعلیٰ کی روایت میں اس کی جو تفصیل آئی ہے وہ بالکل یہ بات واضح کر دیتی ہے کہ حضرت ابراہیم نے یہ کام خود کر لیا تھا۔ اس میں یہ بیان ہوا ہے کہ حضرت ابراہیم کو جب اللہ کی طرف سے حکم ہوا کہ ختنہ کرو تو انہوں نے قدوم (بڑھئی کے کام کا ایک آلہ) لیکر ختنہ کر لیا۔ اس سے ان کو سخت تکلیف ہوئی۔ اللہ کی طرف سے وحی آئی کہ ابراہیم تم نے جلدی کی، ورنہ ہم تمہیں خود اس کا آلہ بتا دیتے۔ انہوں نے عرض کیا اے رب، میں نے پسند نہ کیا کہ تیرے حکم کی تعمیل میں دیر کروں۔ (فتح الباری جلد ۶ ص ۲۴۵)

(۱۰) اس مضمون کی احادیث بخاری کتاب الانبیاء، کتاب الجہاد اور کتاب الأیمان و النذور میں موجود ہیں۔ ان مختلف احادیث میں سے کسی میں حضرت سلیمان کی بیویوں کی تعداد ۶۰، کسی میں ۷۰، کسی میں ۹۰، کسی میں ۹۹ اور کسی میں ۱۰۰ بیان کی گئی ہے اور سب کی سندیں مختلف ہیں۔ اتنی مختلف سندوں سے جو بات محدثین کو پہنچی ہو، اس کے متعلق یہ کہنا تو مشکل ہے کہ وہ بالکل ہی بے اصل ہوگی، لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان کو سمجھنے میں حضرت ابوہریرہ سے کوئی غلطی ہوئی ہے، یا وہ پوری بات سن نہیں سکے ہونگے۔ ممکن ہے حضور نے یہ فرمایا ہو کہ حضرت سلیمان کی بہت سی بیویاں تھیں جن کی تعداد یہودی ۶۰، ۷۰، ۹۰، ۹۹ اور ۱۰۰ تک

بیان کرتے ہیں، اور حضرت ابوہریرہؓ نے سمجھا ہو کہ یہ حضور کا اپنا بیان ہے۔ اسی طرح یہ بھی ممکن ہے کہ حضور نے حضرت سلیمان کے قول کو اس طرح بیان کیا ہو کہ "میں اپنی بیویوں کے پاس جاؤں گا اور ہر بیوی سے ایک مجاہد پیدا ہوگا" اور حضرت ابوہریرہؓ یہ سمجھے ہوں کہ "ایک رات میں جاؤنگا"۔ اس طرح کی غلط فہمیوں کی مثالیں متعدد روایات میں ملتی ہیں جن میں سے بعض کو دوسری روایتوں نے صاف کر دیا، اور بعض صاف ہونے سے رہ گئیں۔ زبانی روایتوں میں ایسا ہو جانا کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ اور اس طرح کی چند مثالوں کو لے کر پورے ذخیرۂ حدیث کو ساقط الاعتبار قرار دینا کسی معقول آدمی کا کام نہیں ہو سکتا۔

رہا انشاء اللہ کا معاملہ، تو یہ کسی روایت میں بھی نہیں کہا گیا ہے کہ حضرت سلیمان نے جان بوجھ کر انشاء اللہ کہنے سے احتراز کیا تھا۔ اس لیے اس میں توہینِ انبیاء کا کوئی پہلو نہیں ہے۔ یہ الفاظ آپ نے آخر کس روایت میں دیکھے ہیں کہ "کسی نے کہا انشاء اللہ بھی ساتھ ہی کہیے لیکن آپ نے پروا نہ کی"؟ حدیث میں جو الفاظ آئے ہیں وہ یہ ہیں کہ فقال له صاحبه ان شاء الله فلم يقل"۔ ان کے ساتھی نے ان سے کہا ان شاء اللہ، مگر انہوں نے نہ کہا"۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب حضرت سلیمانؑ کے منہ سے یہ بات نکلی تو پاس بیٹھے ہوئے ایک شخص نے خود کہا "ان شاء اللہ" اور حضرت سلیمانؑ نے اس کے کہہ دینے کو کافی سمجھ لیا اور اپنی زبان سے اس کا اعادہ نہ کیا۔

(۱۱) یہ حدیث بخاری کتاب الوضوء کے متعدد ابواب میں آئی ہے، اور حدیث کی دوسری کتابوں میں بھی موجود ہے، مگر کسی میں بھی حضرت حذیفہ کے یہ الفاظ نہیں ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے "میرے سامنے کھڑے ہو کر پیشاب کیا"۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ یہ الفاظ آپ کو کہاں ملے؟ ان کے تو اصل الفاظ یہ ہیں کہ "میں اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم چلے جا رہے تھے کہ راستے میں آپ ایک کوڑے کے ڈھیر کی طرف گئے جو ایک دیوار کے پیچھے تھا اور آپ کھڑے ہوئے جیسے تم میں سے کوئی کھڑا ہوتا ہے اور آپ نے پیشاب کیا۔ میں ہٹ کر دور جانے لگا تو آپ نے مجھے اشارہ کیا اور میں آپ کے پیچھے کھڑا ہو گیا یہاں تک کہ آپ فارغ ہو گئے"۔ اس سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضور نے دیوار اور ڈھیر کے درمیان

کھڑے ہو کر پیشاب کیا تاکہ دونوں طرف سے پردہ رہے، اور حضرت حذیفہؓ کو روک کر پیچھے کھڑا کیا، کیونکہ اس صورت میں نظر آنے کا کوئی امکان نہیں رہتا۔

یہاں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ مستند روایات کے مطابق نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ بیٹھ کر ہی پیشاب کرتے تھے، مگر اس موقع پر آپ نے کسی عذر کی وجہ سے ایسا کیا تھا۔ اور حضرت حذیفہ نے یہ روایت اس لیے بیان کی تھی کہ اُن کے زمانے میں بعض لوگ پیشاب کے معاملے میں زیادہ شدت برتنے لگے تھے

(۱۲) یہ روایات بخاری کتاب احادیث الانبیاء، اور مسلم باب اثبات الشفاعۃ میں موجود ہیں۔ اس کے علاوہ دوسری کتب حدیث میں بھی آئی ہیں۔ ان سب روایات کی اسناد کو اور ان کی کثرتِ طرق کو دیکھنے کے بعد اس امر میں تو کوئی شبہ نہیں رہتا کہ حضرت ابوہریرہؓ ہی ان کے راوی ہیں، کیونکہ اتنے کثیر راویوں کے بارے میں، خصوصاً جبکہ اُن میں سے اکثر و بیشتر ثقہ تھے، یہ گمان نہیں کیا جاسکتا کہ انہوں نے ایک صحابی کا نام لے کر قصداً ایک غلط روایت تصنیف کی ہوگی۔ رہے حضرت ابوہریرہ تو اُن پر ہم یہ شُبہ تک نہیں کر سکتے کہ وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کوئی غلط بات منسوب کریں گے۔ لیکن ہمارے لیے ان راویوں کو جھوٹا ماننا جس قدر مشکل ہے اس سے بدرجہا زیادہ مشکل یہ باور کرنا ہے کہ ایک نبی نے جھوٹ بولا ہوگا، یا نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے معاذ اللہ، ایک نبی پر دروغ گوئی کا جھوٹا الزام لگایا ہوگا۔ اس لیے لامحالہ ہم یہ سمجھنے پر مجبور ہیں کہ اس معاملہ میں ضرور کوئی غلط فہمی ہوئی ہے جس کی بنا پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد صحیح طور پر نقل نہیں ہوا۔ اور اس کی دلیل یہ ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کے جو تین "جھوٹ" اس روایت میں بیان ہوئے ہیں ان میں سے دو تو قطعاً جھوٹ نہیں ہیں، اور تیسرا جھوٹ دراصل بنی اسرائیل کا جھوٹ ہے جو انہوں نے بائیبل میں ایک جگہ نہیں بلکہ دو مقامات پر حضرت ابراہیمؑ کی طرف منسوب کیا ہے۔

پہلے دو واقعات خود قرآن مجید میں بیان ہوئے ہیں۔ مگر نہ ان میں سے کسی کو اللہ تعالیٰ نے جھوٹ قرار دیا، اور نہ صورتِ واقعہ سے ان کے جھوٹ ہونے کا کوئی ثبوت ملتا ہے۔ پہلا واقعہ یہ ہے کہ جب حضرت ابراہیمؑ کے کنبے قبیلے کے لوگ اپنے ایک مشرکانہ میلے کے لیے شہر سے باہر

جلنے لگے تو آپ یہ عذر کر کے پیچھے ٹھیر گئے کہ اِنِّیْ سَقِیْمٌ (میں بیمار ہوں)۔ اس کو جھوٹ قرار دینے کے لیے کسی مستند ذریعہ سے یہ معلوم ہونا ضروری ہے کہ حضرت ابراہیمؑ اُس وقت بالکل تندرست تھے، کسی قسم کی شکایت اُن کو نہ تھی۔ لیکن یہ بات نہ اللہ نے بتائی نہ اس کے رسولؐ نے۔ پھر اسے آخر کس بنا پر جھوٹ کہا جائے؟ دوسرا واقعہ یہ ہے کہ جب حضرت ابراہیمؑ نے اپنی قوم کے بت خانے میں گھس کر بڑے بُت کے سوا باقی سارے بُت توڑ دیے، تو قوم کے لوگوں نے تلاش شروع کی کہ یہ فعل کس نے کیا ہے۔ بعض لوگوں نے حضرت ابراہیمؑ پر شبہ ظاہر کیا۔ چنانچہ وہ بلائے گئے اور ان سے پوچھا گیا کہ تم نے ہمارے خداؤں کے ساتھ یہ حرکت کی ہے؟ انہوں نے جواب دیا بَلْ فَعَلَهٗ كَبِيْرُهُمْ هٰذَا فَسْـَٔلُوْهُمْ اِنْ كَانُوْا يَنْطِقُوْنَ ۔ (بلکہ یہ فعل ان کے اِس بڑے نے کیا ہے، اِن زخمی بتوں سے پوچھ لو اگر یہ بول سکتے ہیں)۔ اِس فقرے کے الفاظ خود بتا رہے ہیں کہ حضرت ابراہیمؑ نے یہ بات ایک جھوٹے بیان کی حیثیت سے نہیں بلکہ شرک کے خلاف ایک دلیل کی حیثیت سے فرمائی تھی۔ ان کا مدعا دراصل پوچھنے والوں کو اس حقیقت پر متنبہ کرنا تھا کہ تمہارے یہ کیسے خدا ہیں جو بیچارے اپنی داستانِ مصیبت تک نہیں سنا سکتے۔ اس بات کو تو کوئی معمولی سخن فہم آدمی بھی جھوٹ نہیں کہہ سکتا، کجا کہ ہم نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ بدگمانی کریں کہ آپ نے اسے جھوٹ قرار دیا ہوگا۔

رہا تیسرا "جھوٹ" تو وہ دراصل اُن مہمل افسانوں میں سے ایک ہے جو بائیبل میں انبیاء کے نام پر گھڑے گئے ہیں۔ بائیبل کی کتاب پیدائش میں یہ واقعہ ایک جگہ نہیں بلکہ دو جگہ بیان کیا گیا ہے۔ پہلا واقعہ مصر کا ہے اور وہ بائیبل کے الفاظ میں یہ ہے:۔

> اس نے اپنی بیوی ساری سے کہا کہ دیکھ میں جانتا ہوں کہ تو دیکھنے میں خوبصورت عورت ہے، اور یوں ہوگا کہ مصری تجھے دیکھ کر کہیں گے کہ یہ اس کی بیوی ہے۔ سو وہ مجھے تو مار ڈالیں گے مگر تجھے زندہ رکھ لیں گے۔ سو تو یہ کہہ دینا کہ میں اس کی بہن ہوں . . . . مصریوں نے اس عورت کو دیکھا کہ وہ نہایت خوبصورت ہے . . . . اور وہ عورت فرعون کے گھر میں پہنچائی گئی . . . . پر خداوند نے فرعون اور اس کے خاندان پر ابرام کی بیوی کے سبب سے

بڑی بڑی بلائیں نازل کیں، تب فرعون نے ابرام کو بلا کر اس سے کہا کہ تو نے یہ مجھ سے کیا کیا؟ تو نے مجھے کیوں نہ بتایا کہ یہ تیری بیوی ہے؟ تو نے یہ کیوں کہا کہ وہ میری بہن ہے؟ اسی لیے میں نے اُسے لیا کہ وہ میری بیوی بنے" (باب ۱۲- آیات ۱۱ تا ۲۰)

لطف یہ ہے کہ خود بائیبل ہی کے بیان کے مطابق اُس وقت حضرت سارہ کی عمر ۶۵ سال تھی۔ اس کے بعد دوسرا واقعہ فلسطین کے جنوبی علاقے کا بیان کیا گیا ہے اور وہ یہ ہے:-

"ابرہام نے اپنی بیوی سارہ کے حق میں کہا کہ وہ میری بہن ہے اور جرار کے بادشاہ ابی ملک نے سارہ کو بلوا لیا۔ لیکن رات کو خدا ابی ملک کے پاس خواب میں آیا اور اسے کہا کہ دیکھ تو اُس عورت کے سبب سے جسے تو نے لیا ہے ہلاک ہوگا کیونکہ وہ شوہر والی ہے۔ . . .

. . . اور ابی ملک نے ابرہام کو بلا کر اس سے کہا کہ تو نے ہم سے یہ کیا کیا اور مجھ سے تیرا کیا قصور ہوا کہ تو مجھ پر اور میری بادشاہی پر ایک گناہِ عظیم لایا؟" (باب ۲۰- آیات ۲ تا ۱۰)

بائیبل کے اپنے بیان کی رو سے اُس وقت حضرت سارہ کی عمر ۹۰ سال کی تھی۔ یہ دونوں قصے خود بتا رہے ہیں کہ یہ سراسر جھوٹے ہیں، اور ہم کسی طرح یہ باور نہیں کر سکتے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی تصدیق فرمائی ہوگی۔

اب ایک شخص یہ سوال کر سکتا ہے کہ اگر یہ تینوں باتیں ازروئے درایت غلط ہیں تو اہل روایت نے ان احادیث کو اپنی کتابوں میں درج ہی کیوں کیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ درایت کا تعلق احادیث کے نفس مضمون سے ہے، اور روایت کا تعلق تمام تر سند سے۔ اہل روایت نے جو خدمت اپنے ذمے لی تھی وہ دراصل یہ تھی کہ قابل اعتماد ذرائع سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد سے متعلق جتنا مواد ان کو بہم پہنچے اسے جمع کر دیں۔ چنانچہ یہ خدمت انہوں نے انجام دے دی۔ اس کے بعد یہ کام اہل درایت کا ہے کہ وہ نفس مضامین پر غور کر کے ان روایات سے کام کی باتیں اخذ کریں۔ اگر اہل روایت خود اپنی اپنی فہم کے مطابق درایت کا کام بھی کرتے اور مضامین پر تنقید کر کے اُن ساری روایتوں کو رد کرتے جاتے جن کے مضمون ان کی انفرادی رائے میں مناسب نہ ہوتے، تو ہم اس بہت

سے مواد سے محروم رہ جاتے جو مجموعۂ احادیث مرتب کرنے والوں کے نزدیک کام کا نہ ہوتا اور دوسرے بہت سے لوگوں کے نزدیک کام کا ہوتا۔ اس لیے یہ عین مناسب تھا کہ اہلِ روایت نے زیادہ تر تنقیدِ اسناد تک اپنے کام کو محدود رکھا اور تنقیدِ مضامین کی خدمت انجام دینے والوں کے لیے معتبر اسناد سے بہم پہنچا ہوا مواد جمع کر دیا۔

(۱۳) یہ حدیث بخاری، کتاب بدء الخلق، باب خیر مال المسلم غنم یتبع بہا شعف الجبال، اور کتاب احادیث الانبیاء، باب قول اللہ تعالیٰ واتخذ اللہ ابراہیم خلیلا میں آئی ہے۔ اس مضمون کی تمام احادیث کو جمع کرنے سے جو بات معلوم ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے "وزغ" کو موذی جانوروں میں سے قرار دیا تھا[1]، اور بعض روایات کی رو سے یہ بھی فرمایا تھا کہ دوسرے موذی جانوروں کی طرح اسے بھی مار دیا جائے۔ چنانچہ حضرت عائشہ کی صحیح ترین روایت جو بخاری میں آئی ہے اس میں وہ فرماتی ہیں:

ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال الوزغ الفویسق ولم اسمعہ امر بقتلہ	نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے وزغ کو فویسق (موذی) فرمایا، مگر میں نے یہ نہیں سنا کہ آپ نے اسے مار ڈالنے کا بھی حکم دیا ہو۔

دوسری ایک روایت جو مسند احمد اور ابن ماجہ میں حضرت عائشہ سے مروی ہے، اس میں مار دینے کا بھی ذکر ہے اور حضرت ابراہیم پر آگ پھونکنے کا بھی، مگر جیسا کہ حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں لکھا ہے، والذی فی الصحیح اصح، یعنی صحیح بخاری والی روایت ہی زیادہ صحیح ہے۔

پھر بخاری کی اس روایت میں یہ الفاظ بھی ہیں کہ وزعم سعد بن ابی وقاص ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم امر بقتلہ۔ یعنی "سعد بن ابی وقاص کا دعویٰ یہ تھا کہ حضور نے اسے مار ڈالنے کا حکم دیا"

---

[1] وزغ کے اصل معنی گرگٹ کے ہیں نہ کہ چھپکلی۔

[2] حدیث میں آتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے چند جانوروں کو فواسق (موذی) قرار دے کر فرمایا تھا کہ انہیں حرم میں اور حالتِ احرام میں مار دینے کی بھی اجازت ہے۔ بچھو، باؤلا کتا اور چوہا بھی ان میں شامل ہے۔

لیکن اس روایت میں یہ تصریح نہیں ہے کہ حضرت سعد بن ابی وقاص سے یہ بات کس نے سنی۔ دارقطنی میں یہ روایت اس طرح ہے کہ عن ابن شہاب عن سعد بن ابی وقاص۔ مگر ابن شہاب نے حضرت سعد کو نہیں دیکھا۔ اس لیے یہ روایت منقطع ہے۔

آخر میں ام شریک کی روایت آتی ہے جس میں مار ڈالنے کے حکم کی بھی تصریح ہے اور اس وجہ کی بھی کہ یہ جانور حضرت ابراہیم پر آگ پھونکتا تھا۔ ممکن ہے اس میں دو چیزیں خلط ملط ہو گئی ہوں۔ ایک اس جانور کا موذی ہونا، جو صحیح ترین روایت کی رُو سے حضور نے فرمایا تھا، دوسرے اس کے بارے میں آگ پھونکنے کا وہ قصہ جو عوام میں مشہور تھا۔ تاہم اگر صحیح بات وہی ہو جو ام شریک والی روایت میں آئی ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ گرگٹ کی پوری نسل کو اس لیے مار ڈالا جائے جائے کہ اس کے ایک فرد نے حضرت ابراہیم پر آگ بھڑکائی تھی۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ایک موذی جانور ہے اور اس کو دوسرے موذی جانوروں کی طرح انسان سے دشمنی ہے، چنانچہ سارے جانوروں میں سے یہی وہ جانور تھا کہ جب حضرت ابراہیم کو آگ میں ڈالا گیا تو اس نے اس آگ کو پھونکنے کی کوشش کی۔ یہاں یہ سوال پیدا ہی نہیں ہوتا کہ گرگٹ کی پھونک میں آگ بھڑکانے کی طاقت کہاں سے آئی اس لیے کہ حدیث میں سرے سے یہ کہا ہی نہیں گیا ہے کہ وہ آگ اس کے بھڑکانے سے بھڑکی تھی۔

(۱۴) یہ روایت مسلم کتاب الصلوٰۃ، باب سترۃ المصلی میں ہے۔ اس میں امام مسلم نے وہ پورا مواد جمع کیا ہے جو سترے کے مسئلے سے متعلق ان کو معتبر سندوں سے پہنچا تھا، اور اس کے سارے پہلو ہمارے سامنے رکھ دیے ہیں۔ اس کی کسی ایک روایت کو لے کر کوئی نتیجہ نکال بیٹھنا صحیح نہیں ہے، بلکہ ساری روایتوں پر جامع نگاہ ڈالنے سے ہی آدمی صحیح نتیجہ اخذ کر سکتا ہے۔ اصل بات جو ان احادیث سے معلوم ہوتی ہے یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے نمازی کو اپنے آگے سترہ رکھنے کا حکم دیا تھا اور اس کی وجہ سمجھاتے ہوئے یہ بتایا تھا کہ اگر آدمی سترہ رکھے بغیر نماز کے لیے کسی کھلی جگہ کھڑا ہو جائے گا تو عورتیں، کتے، گدھے سب اس کے سامنے سے گذریں گے۔ اس

بات کو سن کر بعض لوگ اس مسئلے کو یوں بیان کرنے لگے کہ عورت، کتے اور گدھے کے گذرنے سے نماز قطع ہو جاتی ہے۔ یہ باتیں جب حضرت عائشہ کو پہنچیں تو انہوں نے فرمایا ان المرأة لدابة سوء (پھر تو عورت بڑی بری جانور ہوئی)، عدلتمونا بالکلاب والحمر (تم لوگوں نے تو ہم کو گدھوں اور کتوں کے برابر کر دیا)، ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم کان یصلی من اللیل وانا معترضة بینه وبین القبلة کاعتراض الجنازة (نبی صلی اللہ علیہ وسلم تہجد کو نماز پڑھتے تھے اور میں ان کے اور قبلے کے درمیان جنازے کی طرح پڑی ہوتی تھی)۔

(۱۵) اس مضمون کی روایات بخاری نے کتاب بدء الخلق اور کتاب الطب میں نقل کی ہیں۔ نیز ابن ماجہ، نسائی، ابو داؤد اور دار قطنی میں بھی یہ موجود ہیں۔ بعض شارحین نے اس حدیث کے الفاظ کو ٹھیک ان کے لغوی معنی میں لیا ہے اور اس کا مطلب یہ سمجھا ہے کہ فی الواقع مکھی کے ایک پر میں زہر اور دوسرے پر میں اس کا تریاق پایا جاتا ہے، اس لیے جب یہ کسی کھانے پینے کی چیز میں گر جائے تو اسے ڈبو کر نکالا جائے۔ اور بعض نے اس کا مطلب یہ لیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم دراصل اس بیجا غرور کا علاج کرنا چاہتے تھے جس کی بنا پر بعض لوگ دودھ کے اس پیالے یا سالن کی اس پوری رکابی سے ہاتھ اٹھا لیتے ہیں جس میں مکھی گری ہو، اور پھر یا تو اسے پھینک دیتے ہیں، یا اپنے خادموں کو کھانے کے لیے دے دیتے ہیں۔ اس طرح کے لوگوں کا غرور توڑنے کے لیے آپ نے فرمایا کہ مکھی اگر تمہارے کھانے میں گر جائے تو اسے ڈبو کر نکالو اور پھر اس کھانے کو کھاؤ۔ اس کے ایک پر میں بیماری ہے، یعنی کبر و غرور کی بیماری جو اسے دیکھ کر تمہارے نفس میں پیدا ہوتی ہے، اور دوسرے پر میں اس کا تریاق، یعنی اس کبر و غرور کا علاج جس کی وجہ سے تم ایسے کھانے کو پھینک دیتے ہو یا اپنے خادموں کو کھلاتے ہو۔ اس معنی کی تائید وہ احادیث بھی کرتی ہیں جن میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے برتن میں تھوڑا سا کھانا چھوڑ کر اٹھ جانے کو ناپسند فرمایا ہے اور حکم دیا ہے کہ اپنی رکابی کو صاف کر کے اٹھو۔ اس حکم کی وجہ بھی یہی ہے کہ جو شخص اس طرح برتن میں کچھ چھوڑ کر اٹھتا ہے وہ گویا یہ چاہتا ہے کہ یا تو اس بقیہ کھانے کو پھینک دیا جائے، یا اسے کوئی دوسرا کھائے۔

آخری سوال جو آپ نے بخاری کے "اصح الکتب بعد کتاب اللہ" ہونے کے بارے میں کیا ہے اس کا مختصر جواب یہ ہے کہ دنیا میں سب سے زیادہ یقینی ذریعے سے تو ہم کو کتاب اللہ پہنچی ہے، کیونکہ اسے ہزارہا آدمیوں نے تواتر نقل کیا ہے۔ مگر اس کے بعد جس کتاب کے مندرجات ہم کو معتبر ترین سندوں سے پہنچے ہیں وہ بخاری ہے، کیونکہ دوسری تمام کتابوں کی بہ نسبت اس کتاب کے مصنف نے سندوں کی جانچ پڑتال زیادہ کی ہے۔ یہ صحت کا حکم صرف اسناد سے متعلق ہے اور یقیناً بالکل صحیح ہے۔ رہی مضامین کی تنقید بلحاظ درایت، تو اس کے متعلق میں اوپر اشارہ کر چکا ہوں کہ یہ کام اہل روایت کے فن سے بڑی حد تک غیر متعلق تھا، اس لیے یہ دعویٰ کرنا صحیح نہیں ہے کہ بخاری میں جتنی احادیث درج ہیں ان کے مضامین کو بھی جوں کا توں بلا تنقید قبول کر لینا چاہیے۔

اس سلسلہ میں یہ بات بھی جان لینے کی ہے کہ کسی روایت کے سنداً صحیح ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس کا نفس مضمون بھی ہر لحاظ سے صحیح اور جوں کا توں قابل قبول ہو۔ ہم کو خود اپنی زندگی میں بارہا اس امر کا تجربہ ہوتا رہتا ہے کہ ایک شخص کی گفتگو کو جب سننے والے دوسروں کے سامنے نقل کرتے ہیں تو صحیح روایت کی کوشش کرنے کے باوجود ان کی نقل میں مختلف قسم کی کوتاہیاں رہ جاتی ہیں۔ مثلاً کسی کو پوری بات یاد نہیں رہتی اور وہ اس کا صرف ایک حصہ نقل کرتا ہے۔ کسی کی سمجھ میں بات اچھی طرح نہیں آتی اس لیے وہ ناقص مفہوم ادا کرتا ہے۔ کوئی دو ان گفتگو میں کسی وقت پہنچتا ہے اور اس کو معلوم نہیں ہوتا کہ پہلے کیا بات ہو رہی تھی۔ اس طرح کے متعدد نقائص ہونے کی وجہ سے بسا اوقات نیک نیتی اور صداقت کے باوجود نقل کی بات اپنی صحیح صورت میں نقل نہیں ہوتی۔ اور ایسا ہی معاملہ حالات اور افعال کی روداد بیان کرنے میں بھی پیش آیا کرتا ہے۔ کبھی ان نقائص کو دوسری روایتیں رفع کر دیتی ہیں، اور سب کو ملا کر دیکھنے سے پوری تصویر سامنے آجاتی ہے۔ اور کبھی ایک ہی روایت موجود ہوتی ہے جسے اصطلاح علم حدیث میں غریب کہتے ہیں، اس لیے وہ نقص علم روایت کی مدد سے رفع نہیں کیا جا سکتا اور درایت سے کام لیکر یہ رائے قائم کرنی پڑتی ہے کہ اصل بات کیا ہو سکتی تھی، یا یہ کہ یہ بات اپنی موجودہ صورت میں قابل قبول ہے یا نہیں، یا یہ کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مزاج اور انداز گفتگو سے یہ چیز مناسبت رکھتی ہے یا نہیں۔ اس حد تک حدیث میں تحقیق کرنے کی صلاحیت جن لوگوں میں نہ ہو، انہیں اول تو حدیث کی کتابیں پڑھنی ہی نہیں چاہئیں، یا پڑھیں تو کم از کم ان کو فیصلے صادر نہ کرنے چاہئیں۔

رسائل و مسائل

پوسٹ مارٹم اور دیگر طبّی مسائل

سوال: سابق خط کے جواب سے میری تشفی نہیں ہوئی[1]۔ آپ نے لکھا ہے کہ پوسٹ مارٹم کی ضرورت بھی مسلّم ہے اور احکامِ شرعیہ میں شدید ضرورت کے بغیر اس کی گنجائش بھی نظر نہیں آتی"۔ مگر مشکل یہ ہے کہ طبّی نقطۂ نگاہ سے کم از کم اُس مریض کی لاش کا پوسٹ مارٹم تو ضرور ہونا چاہیے جس کے مرض کی تشخیص نہ ہو سکی ہو یا ہونے کے باوجود علاج بیکار ثابت ہوا ہو۔ اسی طرح "طبّی قانونی" (Medico-legal) نقطۂ نظر سے بھی نوعیتِ جرم کی تشخیص کے لیے پوسٹ مارٹم لازمی ہے۔ علاوہ ازیں اناٹومی، فزیالوجی اور آپریٹو سرجری کی تعلیم بھی جسدِ انسانی کے بغیر ناممکن ہے۔ آپ واضح فرمائیں کہ ان صورتوں پر شرعاً شدید ضرورت کا اطلاق ہو سکتا ہے یا نہیں؟

آپ نے ایک جگہ تحریر کیا ہے کہ "آج کل الکوہل کو ایک اچھا محلّل ہونے کی حیثیت سے دوا سازی میں استعمال کیا جاتا ہے، لیکن جب فنِ دوا سازی کو مسلمان بنایا جائے گا تو الکوہل کے استعمال کو ترک کر دیا جائے گا"۔ لیکن کیمیاوی اصطلاح میں الکوہل کے لفظ کا اطلاق صرف نشہ آور اجزاء پر نہیں ہوتا، بلکہ یہ علم الکیمیا میں اشیاء کے ایک خاص گروپ کا نام ہے جس میں مُسکرات کے علاوہ اور بہت سی چیزیں شامل ہیں، تو کیا پھر ان سب اشیاء کا استعمال ناجائز ہوگا؟ علاوہ ازیں الکوہل کا جسم پر خارجی استعمال بھی ہوتا ہے، کیونکہ وہ صرف محلّل ہی نہیں بلکہ جراثیم کُش بھی ہے۔ کیا یہ استعمال بھی ممنوع ہے؟

تفہیم القرآن میں آپ نے ایک مقام پر یہ بھی لکھا ہے کہ مسلمان اطبا دوا سازی میں الکوہل

[1] سائل کا پچھلا خط اور اس کا جواب ترجمان القرآن بابت ماہ اپریل ۱۹۵۲ء میں شائع ہو چکا ہے۔